نذر صابری: اسلاف کے کاروانِ تحقیق سے بچھڑے ہوئے ایک محقق اور ادیب

عارف نوشاہی*

با کاروان حُلّه برفتم زسیستان
با حلهٔ تنیده زدل، بافته زجان
با حلّه ای بریشم ترکیب او سخن
با حلّه ای نگارگر نقش او زبان
(فرخی سیستانی)

(I)

میں انیس سال کا تھا۔ خانۂ فرہنگ ایران، راول پنڈی میں فارسی کا سبق لیتا تھا اور بقول غالب:

یعنی یہی کہ رفت گیا، اور بُود تھا

والی منزل تھی۔ وہاں میری اُستادوں میں ایک ایرانی خانم، اقدس رضوانی ہوا کرتی تھیں۔ میں ان کا چہیتا شاگرد تھا۔ چہیتا اس اعتبار سے کہ سبق اچھی طرح یاد کرتا تھا اور ان کی دی ہوئی مشقیں خوب بنا سنوار کر لکھتا تھا۔ امتحانوں کے نتیجے میں ہمیشہ ممتاز رہتا تھا اور ان کی نظروں میں آ گیا تھا۔ استاد شاگرد میں کوئی چنگاری دیکھے تو اس کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے اسے شعلۂ جوالہ بنا دے۔ خانم رضوانی نے مجھ میں فارسی کا یہ شوق دیکھا تو اپنے شوہر سے ذکر کیا۔ ان کے شوہر بھلا کون تھے؟ کتب خانۂ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے کتاب دار آقائے محمد حسین تسبیحی جو بعد میں ڈاکٹر ہوئے۔ پاکستان میں فارسی کا ذوق رکھنے والا پچھلی نسل کا ہر شخص ڈاکٹر تسبیحی کے نام سے واقف ہی ہے۔ وہ مجھے کتب خانۂ گنج بخش لے گئے اور وہاں اپنا معاون رکھ لیا اور یوں جادۂ فارسی پر میرا سفر شروع ہوا جو ہنوز ناتمام ہے۔

یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ مرکز تحقیقات فارسی اُس زمانے میں راول پنڈی کی میو روڈ پر کرائے کی ایک کوٹھی نمبر ۱۸۴ میں ہوا کرتا تھا۔ اب یہ سڑک راشد منہاس شہید کے نام سے منسوب ہے اور کوٹھی نمبر ۱۸۴ تا حال وہاں موجود

* سابق پروفیسر، شعبہ فارسی، گورڈن کالج، راول پنڈی، مقیم اسلام آباد

ہے، لیکن مرکز تحقیقات فارسی ۱۹۷۶ء میں ہی وہاں سے اسلام آباد منتقل ہو گیا تھا اور اب تک سات گھر بدل چکا ہے! کتب خانۂ گنج بخش، عربی فارسی مخطوطات، مطبوعات اور رسائل جمع کرتا تھا اور یہ ایسے محققوں کی آمد و رفت کی جگہ تھی جو خاص طور پر فارسی کے حوالے سے کلاسیک موضوعات ادب، تاریخ، تذکرہ، تصوّف پر کام کرتے تھے۔ سو میرے لیے بہت اچھا موقع نکل آیا کہ یہاں آنے والے ایرانی، پاکستانی اور غیر ملکی دانش وروں، مصنفوں، خطاطوں، ادیبوں اور شاعروں کو قریب سے دیکھوں۔ بلا مبالغہ یہاں ایسے پچاسیوں لوگوں سے ملاقات ہوئی جو کہکشانِ علم و ہنر کے روشن ستارے تھے اور اب غروب ہو چکے ہیں۔ پیر حسام الدین راشدی، حکیم محمد سعید، محمد عبداللہ چغتائی، حافظ محمد یوسف سدیدی، انور حسین نفیس رقم، ڈاکٹر احمد حسن دانی، ڈاکٹر راجہ غلام سرور، ڈاکٹر محمد باقر اور نہ جانے کون کون وہاں آئے اور میں نے انھیں دیکھ کر اپنے اندر توانائی اور فخر کا احساس جذب کیا۔

(II)

یہ ۱۹/فروری ۱۹۷۵ کا دن تھا۔ کتب خانۂ گنج بخش میں چھوٹی سی جماعت[1] کے ساتھ ایک شخص داخل ہوا جو اُس جماعت کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی، ان سے الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ سادہ لباس، شلوار قمیص، سر پر خانے دار رومال، پاؤں میں ہلکی پھلکی چپل، اونچا قد، سر اور ڈاڑھی کے بال سفید، آنکھوں میں بلا کی چمک، ہونٹوں پر مسلسل تبسم جو کبھی کبھی کھل کر قہقہے میں تبدیل ہو جاتا۔ یہی نذر صابری (۱۹۲۳ - ۲۰۱۳ء) تھے۔ اس ملاقات کے بعد اُن سے ایسا تعلقِ خاطر استوار ہوا جو ان کی وفات (۱۱/دسمبر ۲۰۱۳ء) تک نہ ٹوٹا۔ غلط کہہ گیا، ٹوٹا تو اب بھی نہیں ہے۔

نذر صابری، جن کا اصل نام ''غلام محمد'' کم لوگوں کو ہی معلوم ہوگا، خطۂ پنجاب کی آخری شمالی سرحد، دریاے کابل اور دریاے سندھ کے سنگم پر واقع، اپنے دامن میں تاریخ کی کئی کہانیاں سمیٹے شہر اٹک میں رہتے تھے۔ آبائی وطن جالندھر تھا۔ والد کام کے سلسلے میں ملتان میں مقیم تھے کہ صابری صاحب وہیں یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ ایک سال بعد خاندان واپس جالندھر چلا گیا۔ صابری صاحب وہیں کھیلے، کودے، پڑھے، بڑھے۔ بہ قول ان کے ''۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں ایک بار پھر بہشت (وطن) کو چھوڑنا پڑا''[2]۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے ہر مہاجر کا پہلا پڑاؤ لاہور تھا، سو وہ بھی تین ماہ لاہور میں رُکے۔ پھر اٹک کو زیب مکان کیا۔ صابری صاحب پہلے کیا کرتے تھے، مجھے نہیں معلوم، لیکن جب مجھ سے ملے تب گورنمنٹ پوسٹ گریجوئیٹ کالج، اٹک کے کتاب دار تھے۔ میں بھی کتاب دار ہی تھا۔ اس لحاظ سے ہم پیشہ تھے اور کتابوں سے ہماری مشترکہ دل چسپی نہ صرف ہمیں قریب تر لائی، بلکہ اس اشتراک میں وسعت آتی گئی اور ہمارے درمیان مخطوطات شناسی، فہرست نویسی، تدوین مخطوطات اور خطاطی ایسے موضوعات تسلسل سے زیر بحث رہے۔

۱۹/فروری ۱۹۷۵ کی اس پہلی ملاقات کے بعد بھی ان سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں، کبھی کتب خانۂ گنج بخش میں، کبھی خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی میں۔ میں ایک بار ان سے ملنے، بغیر پیشگی اطلاع کے، اٹک جا پہنچا۔ یہ ۲۱

رجولائی ۱۹۹۲ء کا دن تھا۔ میں ایران سے گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایران میں مجھے رسالہ غایة الامکان تصنیف تاج الدین اشنوی پر کچھ نیا مواد ملا تھا۔ اس رسالے پر صابری صاحب پہلے کام کر چکے تھے [۳]۔ مجھے یہ مواد انھیں فراہم کرنا تھا۔ سخت دھوپ میں ان کا گھر تلاش کرتے کرتے دو گھنٹے گذر گئے لیکن گھر نہ ملا۔ میں مایوس ہو کر واپس اسلام آباد جا ہی رہا تھا کہ ایک خضر صورت نے ان کے گھر کا صحیح پتا بتایا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر خوشی اور حیرت سے صابری صاحب کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

(III)

صابری صاحب کو مجھ سے بہت اُنس تھا، میں خود ستائی سے بچنے کے لیے احتیاطاً لفظ ''اُنس'' استعمال کر رہا ہوں، درحقیقت یہ انس سے آگے کی کوئی منزل تھی جس کی نشان دہی نہ صرف ان کے میرے نام خطوط سے ہوتی ہے بلکہ اپنے مرض الموت میں ان کا نیم بے ہوشی میں ''عارف نوشاہی'' پکارنا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ میں ان کے لاشعور میں بھی موجود تھا۔

صابری صاحب کی ولادت ۱۹۲۳ء کی اور میری ۱۹۵۵ء کی ہے۔ اس حساب سے وہ مجھ سے ۳۲ برس بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی بزرگی کا کمال تھا کہ عمر کے اس تفاوت کے باوجود مجھے کبھی خُردی کا احساس نہ دلایا بلکہ الٹا میری ''سیادتِ نسبی'' کو ساری عمر میری تکریم کا وجہ جواز بنائے رکھا۔ حالاں کہ میں ذاتی طور پر حسب و نسب کو انسان کی ذاتی خوبیوں سے برتر نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک فقط اعلیٰ نسبی کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے جب تک ذاتی مکرمت اور اخلاق عالیہ نہ ہو۔ صابری صاحب کے دادا، ہمارے خاندان یعنی نوشاہی سلسلے میں مرید تھے، لیکن میں نے اس نسبت کو بھی باہمی تعلق میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

ہمارے تعلق کے شجر کی آبیاری، نصف ملاقاتوں یعنی مکتوب نگاری کے ذریعے زیادہ ہوئی اور اس پر برگ و بار بھی اس خط کتابت سے ہی لگے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ صابری صاحب کے کسی خط کا بروقت جواب نہ دیا اور نہ ہی خط لکھ کر ان کا حال پوچھا تو وہ بہت محبت بھرا گلہ کرتے اور اپنی محبت کا اس وفور سے یقین دلاتے کہ مجھے شرمندہ ہونا پڑتا:

ای یارِ مہربانم برتو سلامِ بادا!

> کبھی آپ نے سوچا تو ہوگا کہ باضابطہ مراسلہ باز کو کیا ہوا؟ فروری کے بعد نہ کبھی آیا اور مارچ کے بعد نہ کبھی خط لکھا۔ کاش کبھی آپ نے لکھ کر پوچھا ہوتا، مگر ایک جانب سے خط نہ آنے سے آپ کو کیا کمی محسوس ہوئی ہوگی؟ خدا آپ کے احباب میں شب و روز اضافہ کرے۔ میں آپ کے پاس آتا رہا ہوں، اپنی ضرورتوں کے تحت آتا رہا ہوں۔ ذوق و طلب کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا تھا؛ آ جاتا تھا، کسی پر احسان تو نہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے یاد کرتا۔ میرے نہ ملنے سے خدا نہ کرے کہ آپ کوئی کمی محسوس کریں۔ البتہ مجھے شدت سے کمی محسوس ہو رہی ہے، لہٰذا خط لکھ رہا ہوں اور آپ سے جواب کا اُمیدوار ہوں [۴]۔

میری خاموشی انھیں بہت کھلتی تھی:

> آپ کا ایک خط ۳۱ر دسمبر ۹۸[۱۹]ء کو وصول ہوا تھا، جس کا جواب ۶ر جنوری ۹۹[۱۹]ء، یعنی اگلے سال دیا گیا۔ اب آپ بھی شاید اس کا جواب اگلے سال ہی دیں گے، کیوں کہ جواب آں غزل تو اسی صورت میں ہی ہوسکتا ہے۔ آخر آپ کہاں ہیں؟ کس دلدل میں پھنس گئے ہیں؟ کس صحرا میں گم ہوگئے ہیں اور یہ گم ہونے کا کون سا انداز ہے؟ اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہو تو ضرور اس صورتِ حال کو قائم رکھیے گا۔ وگرنہ اِدھر آپ کی خموشی نقصان کر رہی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ آپ کے جواب آنے پر بات آگے بڑھے گی۔ فی الحال یہیں پر ختم کرتا ہوں[۵]۔

صابری صاحب سے علمی معاملات پر اختلافات بھی ہوتے رہتے تھے۔ یوں تو اکثر دوستیاں ذاتی معاملات پر اختلاف سے بگڑتی ہیں، لیکن میرا تجربہ رہا ہے کہ علمی معاملات پر اختلاف بھی دوستوں کے درمیان رنجش ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کہ اس علمی اختلاف کو کس حد تک برداشت کر کے تعلقات کو بحال رکھا جاتا ہے۔ یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے میں نے عالم گیری عہد میں، اٹک کے ایک کاتب اور مخطوطہ نویس نصر اللہ بن عبدالسلام بھیروی (ولادت: ۱۰۷۶یا۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۵یا۱۶۶۶ء) پر ایک تعارفی مقالہ لکھا اور شائع کروایا[۶]۔ یہ مقالہ کسی وجہ سے صابری صاحب کی نظر سے نہ گذرا ہوگا۔ ۱۹۹۸ء میں انھوں نے **المرآقفی شرح اسماء المشکوۃ** شائع کی[۷] تو اتفاق سے اس کا مصنف بھی نصر اللہ بن عبدالسلام انکی تھا اور زمانہ بھی وہی تھا۔ نام اور زمانے کی اس مماثلت نے میری توجہ حاصل کی اور میں نے اسی موضوع پر ایک اور مقالہ لکھ کر شائع کروایا[۸] اور صابری صاحب کو بھی دکھایا۔ میرا موقف یہ تھا کہ میرے پیش نظر جس نصر اللہ بن عبدالسلام کے کتابت کردہ مخطوطات ہیں، وہی **المرآۃ** کا مصنف بھی ہے لیکن صابری صاحب کو اس سے شدّ و مدّ سے اختلاف تھا۔ اس موضوع پر ان سے طویل عرصے تک خط کتابت چلتی رہی۔ اختلاف رائے جب طول پکڑ گیا اور ہم دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم رہے تو شکر رنجی پیدا ہوگئی اور کچھ عرصے تک مراسلت موقوف رہی۔ وہ بھانپ گئے کہ میں ناراض ہوں۔ آخر انھوں نے اپنی بزرگ مَنشی کا ثبوت دیا اور ایک خط میں صرف یہ مصرع لکھ کر معاملہ ختم کر دیا:

بیا کہ ماسپر انداختیم، گر جنگ است[۹]

اب یاد نہیں پڑتا کہ ان سے آخری روبرو ملاقات کب ہوئی؟ لیکن خط کتابت کا سلسلہ ۲۰۱۰ء تک قائم رہا۔ ۱۷ر فروری ۲۰۱۱ء کو ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا آخری خط آیا۔ ان دنوں وہ خراسان کے ایک صوفی، شیخ زین الدین ابوبکر محمد خوافی (۷۵۷-۸۳۸ھ) کی فارسی کتاب **منہج الرشاد لنفع العباد** پر کام کر رہے تھے اور مجھ سے مسلسل رابطے میں تھے۔ صابری صاحب کے منہج الرشاد پر کام کی بنیاد مکھڈ والے نسخے پر تھی۔ میں نے انھیں نہ صرف منہج الرشاد کا وہ متن مہیا کیا جو نجیب مایل ہروی نے اپنی کتاب **این برگ ہای پیر** میں تہران ۲۰۰۴ء سے شائع کیا تھا بلکہ استنبول سے منہج الرشاد کے ایک اور قلمی نسخے کا عکس بھی منگوا دیا۔ صابری صاحب نے منہج کا جو متن کمپوز کروایا

تھا، وہ مجھے بھیجا۔ میں نے اس کی پروف ریڈنگ کردی اور املا کے سلسلے میں کچھ تجاویز بھی دیں۔ صابری صاحب کی خواہش تھی کہ میں اس پر مقدمہ لکھوں۔ میری تجویز تھی کہ ڈاکٹر معین نظامی صاحب کے رشحاتِ قلم سے بھی ایک تقریظ اس ایڈیشن پر لے لی جائے کہ فارسی اور تصوف کے حوالے سے وہ اس کتاب کی اہمیت اچھے اسلوب میں بیان کرسکیں گے۔ وہ اپنے آخری خط میں لکھتے ہیں:

> منہج الرشاد کی پروف ریڈنگ کا کام آج ختم ہوا تو آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ آپ اس پر کسی نام سے، عنوان سے، حرفِ اولین لکھیں گے اور آپ ہی لکھیں گے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ کتاب اور اس کا مصنف آپ کے مقالے کے زمان و مکان میں ہے اور آپ کے پاس پہلے سے کافی مواد اس نہج پر موجود ہے۔ ڈاکٹر معین نظامی سے میری رسم و راہ نہیں۔ اگر آپ ضروری خیال کرتے ہیں تو فلیپ لکھوالیں۔ آپ سے بے تکلفی ہے، دیرینہ دوستی ہے، سو آپ ہی حرفِ چند [کذا: حرفے چند] لکھیں گے۔ کیا اس کے لیے آخری پرنٹ کی فوٹو سٹیٹ کاپی ضروری ہوگی [۱۰]۔

ایک طرح سے میرے اور صابری صاحب کے درمیان ان باتوں پر اتفاق رائے ہو چکا تھا۔ لیکن بعد میں صابری صاحب کی طرف سے یکسر خاموشی ہوگئی، نہ خط، نہ فون۔ تا آنکہ ایک روز معلوم ہوا **منہج الرشاد** تو چھپ چکی ہے۔ فطری طور پر مجھے یہ کتاب سب سے پہلے دیکھنے کا اشتیاق بلکہ بے تابی تھی، لیکن صابری صاحب نسخہ نہیں بھیج رہے تھے۔ وجہ نامعلوم! آخر صابری صاحب کے ایک محب خاص ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد سے منہج کا نسخہ حاصل ہوا تو یقین مانیے کئی لحاظ سے بہت مایوسی ہوئی۔ منہج پر کام کرنے کی وہ آرزو، جو صابری صاحب کے دل میں ۱۹۶۸ء سے مچل رہی تھی اور وہ اسے ایک شاہ کار بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے، چوالیس سال بعد، ۲۰۱۲ء میں جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو بہ قول شاعر:

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

یہ نہ وہ منہج الرشاد تھی جو صابری صاحب کی ''چہل سال عمر عزیز'' کا خواب تھا اور نہ میرے مشوروں کی عملی تعبیر۔ میرے دیباچے کو تو چھوڑیے جسے لکھوانے کا اصرار خود صابری صاحب ہی کو تھا اور معین نظامی صاحب کی مجوزہ تقریظ بھی دور کی بات ہے، میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ کتاب کا املا رائج ایرانی املا کے مطابق، نون اعلان اور یاے معروف کے ساتھ رکھیے، لیکن جب کتاب چھپ کر آئی تو اس میں نون غنّہ اور یاے مجہول کا بے دریغ استعمال تھا، بعض جگہوں پر تو بالکل نامناسب لگا جیسے: اصطلاحات علمے، صناعات معیشے [کذا] (ص ۱۷)، کتاب میں نہ اشاریہ تھا نہ نسخوں کے اختلاف کی نشان دہی، حالاں کہ نسخۂ ہمدرد (کراچی) وہ خود حاصل کر چکے تھے اور نسخۂ استنبول میں نے انھیں مہیا کیا تھا۔ ان سب چیزوں کو نظر انداز کر کے، صابری صاحب نے خود ہی ایک ہلکا پھلکا مقدمہ لکھا اور گویا چوالیس سالوں سے اپنے سر پر لیا ایک قرض چکا دیا! مقدمے میں کتابت کی پے در پے غلطیاں، ہیں سو ہیں، خود نفس مضمون اور قرائت متن کے

بھی مسائل ہیں، لیکن اب ان کا ذکر کر کے صابری صاحب کی روح کو تڑپانا نہیں چاہتا۔ یہ ضرور کہوں گا کہ اس اشاعت سے بہتر تھا **منہج الرشاد** کے نسخۂ مکھڈ کا صرف عکس شائع کر دیا جاتا تو محققین کے ہاں زیادہ توجہ حاصل کرتا۔ کیوں کہ یہ نسخہ، مصنف کے حین حیات ۸۳۸ھ میں مصنف کے وطن ہرات میں کتابت ہوا ہے اور دستیاب نسخوں میں اقدم الکتابت ہے۔

خیر، منہج الرشاد کی اشاعت کے بعد صابری صاحب سے کوئی رابطہ نہ ہوا کہ ان سے پوچھتا ایسا سب کچھ کیوں ہوا؟ ۷/مارچ ۲۰۱۲ء کو ان کی طرف سے ٹائپ شدہ ایک دعوت نامۂ عام بھیجا گیا جس میں ۱۱ مارچ کو اٹک میں اس کتاب کی تقریب رونمایی میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، لیکن میں نہیں گیا۔

نومبر ۲۰۱۳ء کے آخری ہفتے میں اٹک سے میری ایک پرانی جان پہچان والی، فارسی کی طالبہ تنظیم اختر کا فون آیا کہ ''بابا جی'' (نذر صابری) بیمار ہیں اور نقاہت اور کمزوری کے باعث چپ ہو گئے ہیں، کبھی کبھی بولتے ہیں تو ''عارف نوشاہی'' کہتے ہیں۔ میرا فون نمبر ان کے گھر والوں کو مہیا کیا گیا کہ مجھ سے فون پر بات کروا دیں لیکن بعد میں وہ بالکل ہی خاموش ہو گئے۔ آخری دنوں میں تو کاغذ اور دیوار پر لکھ کر بات کرتے تھے۔ تنظیم اختر کے اس پیغام سے میں سینہ فگار ہوا اور صابری صاحب سے پرانی محبت دل میں جاگ اٹھی۔ ابھی اٹک جا کر صابری صاحب کو دیکھنے کے لیے آج، کل، کر رہا تھا کہ ۱۱/دسمبر کو تنظیم اختر کا دوبارہ فون آیا: **آج علی الصبح بابا جی چلے گئے!** عین سکوت کے عالم میں ان کی زبان پر ''عارف نوشاہی'' نام جاری ہونا، اُس محبت کی دلیل ہے جو اُن کے نہاں خانۂ دل اور شعور کے کسی مخفی گوشے میں سالوں سے صرف میرے لیے مختص تھی۔ اب ایک خلش عمر بھر رہے گی، کاش ''بابا جی'' سے ۱۱ دسمبر سے پہلے ایک بار مل لیا ہوتا۔

(IV)

صابری صاحب کے خطوط کا خزانہ

ہمارے درمیان سینتیس سال تک مراسلت رہی۔ میرے ذخیرۂ خطوط میں صابری صاحب کا پہلا دست یاب خط ۱۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا اُس دور کا ہے جب اٹک، کیمبل پور کہلاتا تھا۔ انھوں نے مجھے آخری خط ۷/مارچ ۲۰۱۲ء کو بھیجا۔ اگرچہ یہ خط نہیں بلکہ ایک ٹائپ شدہ دعوت نامہ ہے لیکن ان کے ساتھ مراسلت کے سلسلے کی آخری کڑی یہی ہے۔ پہلے ای میل انسانی زندگی میں نمودار ہوا تو کاغذی خطوں کی جگہ برقی اور مجازی فضا میں لکھے خطوط نے لے لی۔ چند سال بعد، جب سے موبائل فون اور اس کے متعلقات انسانی زندگی میں داخل ہوئے ہیں، رہی سہی کاغذی مراسلت بھی دم توڑ رہی ہے۔ یہی افتاد میری اور صابری صاحب کے مابین مراسلت پر بھی پڑی۔ وہ ای میل کی بدعت سے تو بچے رہے لیکن موبائل فون سے نہ بچ پائے۔ آخری سالوں میں بہ ذریعہ کاغذ رابطہ کم ہو گیا تھا اور صابری صاحب کے ایک عقیدت مند رانا افضال علی خان صاحب کی وساطت سے کبھی کبھار موبائل فون پر رابطہ ہو جاتا تھا۔

میرے ذخیرۂ خطوط میں صابری صاحب کے کل چھیانوے خطوط محفوظ ہیں۔ اگر ان خطوط کے ورود کی زمانی ترتیب اور تعداد کا خاکہ تیار کیا جائے تو سال بہ سال اس طرح بنتا ہے۔

۱۹۷۵ء: ۲ خطوط [شمارہ ۱-۲]

۱۹۸۱ء: ۳ خطوط [شمارہ ۳-۵]

۱۹۸۲ء: ۱ خط [شمارہ ۶]

۱۹۸۳ء: ۷ خطوط [شمارہ ۷-۱۳]

۱۹۸۴ء: ۳ خطوط [شمارہ ۱۴-۱۶]

۱۹۸۵ء: ۶ خطوط [شمارہ ۱۷-۲۲]

۱۹۸۶ء: ۹ خطوط [شمارہ ۲۳-۳۱]

۱۹۸۷ء: ۹ خطوط [شمارہ ۳۲-۴۰]

۱۹۸۸ء: ۹ خطوط [شمارہ ۴۱-۴۹]

۱۹۹۰ء: ۳ خطوط [شمارہ ۵۰-۵۲]

۱۹۹۱ء: ۵ خطوط [شمارہ ۵۳-۵۷]

[ایک لفافہ مورخہ ۱۰/۱۲/۱۹۹۱ء خالی پڑا ہے اسے شمار نہیں کیا گیا]

۱۹۹۲ء: ۱ خط [شمارہ ۵۸]

۱۹۹۶ء: ۵ خطوط [شمارہ ۵۹-۶۳]

۱۹۹۷ء: ۶ خطوط [شمارہ ۶۴-۶۹]

۱۹۹۸ء: ۲ خطوط [شمارہ ۷۰-۷۱]

۱۹۹۹ء: ۲ خطوط [شمارہ ۷۲-۷۳]

۲۰۰۰ء: ۷ خطوط [شمارہ ۷۴-۸۰]

۲۰۰۱ء: ۲ خطوط [شمارہ ۸۱-۸۲]

۲۰۰۶ء: ۲ خطوط [شمارہ ۸۳-۸۴]

۲۰۰۸ء: ۱ خط [شمارہ ۸۵]

۲۰۰۹: ۴ خطوط [شمارہ ۸۶-۸۹]

۲۰۱۰: ۵ خطوط [شمارہ ۹۰-۹۴]

۲۰۱۱ء: ۱ خط [شمارہ ۹۵]

۲۰۱۲ء: ۱ خط [شمارہ ۹۶]

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے، درمیان میں بعض سال خالی پڑے (اچھا نہیں لگ رہا یہ لفظ۔ گذرے، یا رہے ہوسکتا ہے) ہیں اور طویل وقفے ہیں۔ اس کے باوجود ایک رابطہ تھا جو ٹوٹتا نہیں تھا، حتی کہ اُن سالوں میں، جب میں حصولِ تعلیم کے لیے ایران چلا گیا تھا (۱۹۸۹ - ۱۹۹۳ء)، وہاں بھی صابری صاحب کے کئی خط پہنچتے رہے اور انھوں نے مجھے اپنی محبت کے حصار میں داخل رکھا۔ (حصار میں رکھا ہی کافی ہے۔)

صابری صاحب کے خطوط کے بنیادی مطالب اور مضامین، مخطوطات شناسی، تدوین مخطوطات اور اپنے زیرِ تدوین کتب کے مصنفین اور مصنفات کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ خشک موضوعات، عام لوگوں کی دل چسپی کے نہیں ہیں۔ لیکن صابری صاحب کے اسلوبِ نثر اور زبان و بیان کی لطافت نے اس خشک مضمون کو بھی دل چسپ بنا دیا ہے اور یہ سب ثقیل اور اَدق باتیں وہ ایک بہاؤ میں اس طرح کہہ گئے ہیں کہ پڑھنے والا لطف لیتا ہے۔ میں ان کے اسلوبِ بیان کا ہمیشہ سے مدّاح رہا ہوں۔ ان کی وفات کے بعد ایک بار میں نے ان کے تمام خطوط کو حرف بہ حرف پڑھا تو ایسا لگا جیسے صابری صاحب سامنے بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہم کلامی کا یہ احساس محض تصوّرِ جاناں کا معجزہ نہیں تھا بلکہ صابری صاحب کے ہلکے پھلکے، سہل ممتنع اسلوبِ نثر کا کمال ہے۔

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کا دن تھا، گرمیوں کے روزے تھے۔ یقیناً صابری صاحب کو روزہ لگا ہوگا، بلدیہ اٹک کی مسجد کو گوشۂ عافیت سمجھا۔ قلم کاغذ جیب ہی میں رکھتے تھے۔ مجھے خط لکھنے بیٹھ گئے۔ اسلوب دیکھیے:

> کتنا باریک لکھ رہا ہوں۔ مسجد میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ روزہ کے ساتھ ہوں۔ قلم رواں ہی نہیں ہوتا۔ تھک گیا ہوں بلکہ اُک گیا ہوں۔ تحریر میں شگفتگی کہاں سے آئے؟ آپ بھی پڑھتے پڑھتے اُکتا جائیں گے۔ تحریر کیا ہے؟ صحرا کا سفر ہے، قدم رواں ہی نہیں ہو رہا۔ ہر چند اقبال کا ترانہ ''منزل ما دُور نیست'' گا رہا ہوں؛ دل کو سمجھا رہا ہوں۔ اتنا اَڑیل قلم کبھی نہ ہوا تھا۔ شاید وہ آپ سے ناراض ہے اور کمال بے دلی سے چل رہا ہے۔ مگر وہ مجھے تکلیف کیوں دے رہا ہے۔۔۔ میرا قلم رُو سیاہ ہے مگر جو کچھ اس سے ٹپک رہا ہے یہ شبنم کی طرح پوِتر اور ستارے کی طرح روشن ہے یا یوں کہیے کہ شبدیز ہے جس پر خسرو پرویز سوار ہے۔ چلو شیریں کو بھی سوار کر لیں۔[11]

صابری صاحب کو شعر و شاعری کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ انیس سال کی عمر (۱۹۴۲ء) میں انھوں نے مثنوی معراج نامہ کہہ ڈالی تھی۔ ۱۵۶ شعروں کی اس اردو مثنوی میں انھوں نے بڑی مہارت سے اپنے پچاس سے اوپر فارسی اشعار بھی داخل کر دیے ہیں۔ نظامی، خسرو اور جامی کو وہ اُسی دور میں پڑھ چکے تھے اور وہ اپنے فارسی کلام میں زورِ بیان کو انھی استادوں کا فیض سمجھتے ہیں۔ بنیادی یا ابتدائی طور پر وہ شاعر تھے لیکن ان کا پیشہ۔ کتاب داری۔ انھیں تصنیف و تحقیق کی طرف لے آیا۔ وہ جرنیلی سڑک سے ہٹ کر واقع، اٹک شہر میں رہتے تھے جو اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود، کوئی بڑا علمی مرکز نہیں ہے۔ لے دے کر وہاں گورنمنٹ کالج کا کتب خانہ ہے جو صابری صاحب کا ہی پروردہ ہے۔ ایسے ماحول میں رہ کر ان کو تحقیق اور مطالعہ کے ایسے ایسے موضوعات سوجھتے رہے کہ شہروں میں واقع دانش گاہوں اور تحقیقی اداروں سے

وابستہ پروفیسروں اور ریسرچ اسکالروں کے سر سے گذر جائیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کا میدانِ تحقیق پنجاب کے اٹک سے لے کر ایرانی آذربایجان کے اُشنہ تک پھیلا ہوا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ بلند نظر دانش ور تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نئی نئی تحقیقی کتابوں کی ٹوہ میں رہتے اور مجھ سے بھی سوال کرتے رہتے تھے۔ اپنے ایک خط میں، ایک ہی سانس میں کس کس پرانی کتاب کا ذکر کر گئے ہیں اور کیا کیا سوالات اٹھائے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

آپ نے نجیب مائل ہروی صاحب کے حوالے سے ذکر کیا تھا کہ اُشنوی کا فارسی کلام بھی دریافت ہوا ہے۔ سعید نفیسی کی کتاب تاریخ نظم و نثر در ایران کے صفحہ ۵۰۷ پر ان کے آثارِ علمیہ میں ایک کتاب تاج نامہ کا بھی ذکر آیا ہے، مگر میں اس عبارت کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ آپ ازراہِ کرم اس کو ایک نظر دیکھیے گا۔ کیا یہ نثر کی کتاب ہے یا نظم کی؟ اگر نظم کی ہے تو نجیب صاحب کے دامِ تحقیق و تلاش میں یہی آئی ہوگی۔ پوری تحقیق مطلوب ہے۔ جیسا کہ میں نے گزارش کی تھی جو نسخہ نجیب صاحب نے فوٹو کرا کے روانہ کیا ہے، وہ الذریعہ الی تصانیف الشیعہ کے مطابق محرّم ۷۰۰ھ کا مکتوبہ ہے اور اس کا شمارہ ۹۰۶ ہے۔ یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ کیا اس پر کوئی ترقیمہ نہیں اور ایسی کوئی عبارت درج نہیں، جس سے کتاب یا مصنف کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو رہی ہوں۔ ۹۰۵ نمبر کا نسخہ درکار نہیں۔ اگر اس نسخے کے دو ایک مقامات کی عبارتوں کی صورت نویسی یا عکس مل سکے تو کافی ہوگا۔ ان عبارتوں میں اضطراب ہے اور وہ ہیں:

i۔ این مجموعہ را غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان (بیانِ توحید سے قبل)

ii۔ بر دستِ ساقیِ ازل از زلالِ جمالِ او شربتی بفرست۔ (فصل فی بیانِ مکان)

iii۔ نیشاپور نزدیک است و بغداد دُور (فصل فی بیانِ مکان)

ترجمۂ عوارف المعارف، اُشنوی کی پنج پرسش و پاسخ اصلاً عربی میں تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ شیخ عبدالسلام کاموی [درست: کاموی] کے ایک مرید نے کیا تھا اور وہی اب موجود ہے۔ اسی مرید نے عوارف المعارف کا بھی فارسی ترجمہ کیا ہے۔ (فہرستِ رضوی: جلد ۴: ص ۴۴) یہ عبدالسلام کاموی (کذا) کون ہیں؟ اور ان کا مرید (ترجمانِ عوارف) کون ہے؟ شذالازار میں ایک فاضل ظہیرالدین عبدالرحمن بن علی بن بزغش نام کا آیا ہے۔ اس نے عوارف کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ اس کی تاریخِ وفات ۷۱۶ھ ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور صاحب شیخ صدرالدین جنید بن فضل اللہ بن عبدالرحمن م ۷۹۱ھ ہیں۔ انھوں نے ذیل المعارف فی ترجمۃ العوارف کے نام سے ایک کتاب یادگار چھوڑی تھی۔ خدا کرے کہ آپ کا زیرِ نظر ترجمہ ان میں سے کسی ایک کا ہو۔ چند سال ہوئے ہرات کے کسی فاضل ناشر نے تحقیقاتِ خواجہ پارسا شائع کی تھی۔ اس کو دہلی کے کسی پریس نے طبع کیا تھا۔ استاد خلیل اللہ خلیلی کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ ہاں تو ان کی تاریخِ ہرات کا بھی پتا کیجیے گا[۱۲]۔

اس سے اگلے خط میں نام ور ایرانی محقق سعید نفیسی (۱۸۹۵-۱۹۶۶ء) سے ٹکر لیتے ہیں:

میں یہاں سعید نفیسی مرحوم کی عبارت نقل کرتا ہوں: "آثاری از و ماندہ از آن جملہ کتاب غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان در مزاراتِ ہرات و تاج نامہ در تصوّف، و شعر نیز می سرودہ است۔" (تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبانِ

فارسی تا پایانِ قرنِ دہم ہجری: ص ۷۵۰) سابقہ خط میں جو عبارت اشارۂ خلل پیدا کرتی بتائی گئی تھی، وہ "در مزاراتِ ھرات" تھی۔ اس کا یہاں سیاق و سباق سے کیا تعلق ہے اور اگر یہ یہاں نہ ہوتی تو کیا فرق پڑتا؟ اسے دیکھ کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعید مرحوم کو اس کتاب کے مندرجات اور موضوع کا علم نہ تھا۔ حالانکہ عنوان خود چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ کتاب مسئلۂ زمان و مکان پر ہے اور وہ لکھ رہے ہیں کہ مزاراتِ ہرات کے بارہ میں ہے۔۔۔ اب آپ کا کمال دیکھنا ہے کہ سعید نفیسی کی وکالت کیوں کر کرتے ہیں؟ [۱۳]

زمان و مکان کے موضوع پر ایک قدیم رسالے غایة الامکان فی معرفة الزمان و المکان کو اس کے اصل مصنف تاج الدین محمود اُشنوی کے نام سے چھاپنے میں اولیّت اور فضیلت انھی کو حاصل رہی۔ بعد میں پروفیسر نذیر احمد (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) اور نجیب مائل ہروی (افغان) جیسے محققوں نے اسی کی تایید کی اور اس رسالے کے غلط انتساب (بہ عین القضات ہمدانی) کی آوازیں صابری صاحب کے بلند آہنگِ تحقیق میں دب کر رہ گئیں [۱۴]۔ مائل ہروی نے صابری صاحب کی کاوش کی تحسین یوں کی ہے:

بدین وسیله مجدداً یادآور می شوم که فضل تقدّم در عرضه کردن غایة الامکان، از آنِ محققِ دانشی آقای نذر صابری است که برای نخستین بار، آن رساله را به نام مؤلفه حقیقی آن، یعنی تاج الدین اُشنوی به چاپ رسانیده اند و هم مقدمه ای محقّقانه برآن نوشته اند که نه تنها از تحقیقات و تتبعات گستردهٔ ایشان پیرامون تصوف و عرفان اسلامی حکایت دارد، بل کتاب شناسان و محققان، و نیز من بنده را مستفیض و بهره مند گردانیده است [۱۵]۔

یعنی: میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ غایة الامکان کی اشاعت کا سہرا دانش ور محقق جناب نذر صابری کے سر پر ہے، جنھوں نے پہلی بار، یہ رسالہ اس کے اصل مصنف یعنی تاج الدین اُشنوی کے نام سے شائع کیا اور اس پر ایک محققانہ مقدمہ لکھا، جو نہ صرف صابری صاحب کے تصوف اور اسلامی عرفان پر وسیع مطالعات اور تحقیقات کا مظہر ہے، بلکہ کتاب شناسوں، محققوں اور مجھ جیسوں کو بھی مستفیض اور بہرہ مند کرتا ہے۔

زمان و مکان کے موضوع پر لکھنے والوں میں سے، چھٹی صدی ہجری کے ایک اور مصنف شمس الدین ابو ثابت محمد بن عبدالملک دیلمی کے حالات اور اس کی کتابوں کی جستجو نے صابری صاحب کا ذہن کئی سال تک مشغول رکھا اور میرے نام خطوط میں وہ اس موضوع کا سنجیدگی سے تعاقب کرتے رہے۔ آخر جب میں نے تہران سے دیلمی کے بعض رسائل کی نقل لا کر انھیں مہیا کر دی تو بہت خوش وقت ہوئے۔ مجھے بتایئے اٹک کیا، برّصغیر کے جانے مانے علمی مراکز میں بھی بیٹھ کر دیلمی کے بارے میں کام کرنے کا سوچنا، کسی اور کے بس کی بات ہوسکتا ہے؟ یہ ذوق صابری صاحب ہی کا تھا۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، صابری صاحب کو مخطوطات سے خاص شغف تھا۔ ضلع اٹک میں دریاے سندھ کے کنارے واقع ایک دور افتادہ بستی مکھڈ میں ایک چشتی بزرگ مولانا محمد علی مکھڈی (۱۱۶۴ - ۱۲۵۳ھ/ ۱۷۵۰ - ۱۸۳۷ء) اور ان

کے اخلاف نے مخطوطات جمع کیے ہیں۔ صابری صاحب نے ۱۹۶۶ء میں وہاں تواتر سے جانا شروع کیا اور ان مخطوطات کی فہرست ایک مخصوص رجسٹر میں تیار کی جو مکھڈ میں دستیاب ہے۔ بعد میں انھوں نے مختصر فہرست مخطوطات فارسی کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی مجلس نوادرات علمیہ، اٹک سے ۱۹۷۳ء میں شائع کی۔ مکھڈ آمد و رفت اور وہاں مخطوطات کی بازیافت نے آگے چل کر ان پر تحقیق کے کئی دروازے کھولے۔ وہیں انھیں شیخ زین الدین ابوبکر خوافی کے رسالہ منہج الرشاد لنفع العباد، کا قلمی نسخہ ملا جسے ایک نظر میں ہی دیکھ کر فیصلہ کرلیا کہ اس کا تنقیدی متن شائع ہونا چاہیے۔ یہ ان کی بالغ نظری کی دلیل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی طرف سے یہ متن چھپتے چھپتے، نجیب مائل ہروی نے ایران سے اسے شائع کر دیا تھا۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مشہد میں نجیب مایل ہروی اور اٹک میں نذر صابری صاحب کی علمی دل چسپیاں یکساں نوعیت کی رہی ہیں اور دونوں کے کاموں میں کچھ نہ کچھ اشتراک ضرور پایا جاتا ہے۔

صابری صاحب ایک اچھے محقق کی طرح، اپنی کتب شائع کرنے کے بعد بھی ان کو بہتر بنانے کی فکر میں رہتے تھے۔ چناں چہ غایۃ الامکان شائع کرنے کے بعد، وہ اس کے دیگر قلمی نسخوں کو تلاش کرتے رہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ مشہد میں بھی ایک نسخہ ہے تو اسے منگوانے کے لیے بہت جتن کیے۔ آخر نسخے کی نقل لینے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ غایۃ الامکان کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن وہ نہ نکال سکے۔

(V)

خطوط، مکتوب نگار کی شخصیت اور باطن کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جو لوگ صابری صاحب سے نہیں ملے اور انھیں نہیں جانتے، وہ ان کے خطوط سے ان کے مزاج اور افتادِ طبع کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے ان سے بارہا ملا ہوں اور ان کا مکتوب الیہ بھی رہ چکا ہوں۔ اس عرصے میں، میں نے ان کی عادات اور مزاج کو جس طرح دیکھا اور پرکھا، اس کے کچھ تاثرات یہ ہیں:

وہ زُود رنج تھے۔ ایک بار اپنے وسیلے سے متعارف کروانے والے دوستوں کو ہمیشہ اپنے ہی وسیلے سے ملوانا چاہتے تھے اور اپنے ذریعے سے تعلقات رکھنا چاہتے تھے۔ اسی زُود رنجی کا شاخسانہ تھا کہ ایک بار اخبار میں خبر پڑھ لی کہ ایران میں قرآن مجید کا کوئی ایسا نسخہ شائع ہوا ہے جس میں اعراب میں تبدیلی کر کے لفظی اور معنوی تحریف کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔ بس پھر کیا تھا مزید تحقیق کیے بغیر، ایران کے خلاف ہو گئے اور قسم کھا لی کہ اب نہ تو اسلام آباد کے ایرانی ثقافتی قونصلیٹ سے شائع ہونے والا رسالہ دانش وصول کریں گے، نہ ان ایرانی اداروں کا رخ کریں گے، مجھ سے خط کتابت بھی میرے ایرانی ادارے کے پتے کی بجائے، میرے گھر کے پتے پر رکھیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا فیصلے کر لیے، انھی کی زبانی سنیے:

> اب مجھے ایرانی دانش کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس سے تو بے دانشی ہی بھلی۔ ہمیں خدا کے حضور ایک دن جانا ہے اور

اپنی کرتوتوں کا جواب دینا ہے۔ یہ دنیا چند روز کا میلا ہے۔اس کی چمک دمک نے اگر روح اور ضمیر کو گدلا کر دیا تو یہ بڑا گھاٹے کا سودا ہوگا۔آپ سے عرصۂ دراز کے تعلقات ہیں اور میں نے آپ کو بہت ذہین اور باصلاحیت نوجوان پایا ہے اور آپ کے ساتھ مراسم میرے لیے بڑے فائدہ کے حامل تھے،مگر اب میں کسی ایرانی ادارے میں نہیں آؤں گا اور ان سے کسی امر کی توقع بھی نہیں کروں گا۔شاہِ ایران کے دور کی البتہ اگر کوئی کتاب آپ کی وساطت سے ملتی رہے تو مشکور ہوں گا۔آپ گھر کا پتا لکھ دیجیے گا،تا کہ اس طرز کا کوئی خط میں آئندہ آپ کو دفتر کے پتے پر نہ بھیجوں۔اگر میں غلطی پر ہوں تو تصحیح کیجیے گا[۱۶]۔

لیکن میں اسے زُود رنجی سے زیادہ ان کی راسخ الاعتقادی اور اسلام سے وابستگی پر محمول کرتا ہوں۔ان سے یہ بات برداشت نہ ہوئی کہ ایک مسلمان ملک قرآن مجید میں تحریف کرے۔اگرچہ بعد میں یہ معاملہ صاف ہوگیا کہ ایران میں ایسا کچھ نہیں ہوا،لیکن صابری صاحب کا فیصلہ ایک راسخ الاعتقاد شخص کا سا تھا۔

فارسی ادب کے ساتھ ان کی مناسبت طبعی تھی،اوپر سے تصوّف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اور رنگ بھی چشتیہ کا،گویا دو آتشہ تھا۔میں نے ان کے فارسی مجموعۂ کلام بادۂ ناخوردہ کو پڑھ کر لکھا تھا کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ فارسی شعرا کے اس عظیم کاروان سے،جو درۂ خیبر سے گذر کر بہ سوے بنگالہ جا رہا تھا،راستے میں بچھڑ گئے ہیں،کیوں کہ ان کے فارسی کلام میں رودکی،خسرو،حافظ اور جامی کے کلام کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔اٹک میں رہ کر اس اعلا درجے پر فارسی ذوق کی پرورش کرنا بجاے خود ان کی کمال آفرینی ہے،مگر میں سمجھتا ہوں یہ کسبی سے زیادہ وہبی عطا تھی[۱۷]۔

فارسی سے فطری مناسبت کی وجہ سے وہ اس زبان کے طرف دار تھے۔جب ہمارے ہاں مفسرانِ قرآن نے شعوری طور پر ''اللہ'' کی جگہ ''خدا'' اور ''ربّ'' کی جگہ ''پروردگار'' جیسے فارسی الفاظ کو،جو صدیوں سے ہماری زبان پر جاری تھے اور ہمارے ایمان بھی سلامت تھے،مسترد کر دیا اور صرف اللہ اور ربّ کلمات کا استعمال جائز قرار دیا تو صابری صاحب تڑپ اٹھے اور اُن لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی تحریر و تقریر سے فارسی لفظیات نکال دیں اور پھر گفتگو کے مزے لیں اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کریں:

> بعض حلقے اور افراد قرآنِ حکیم کا ترجمہ اور تفسیر کرتے وقت PTV [پاکستان ٹیلی ویژن] پر بھی اللہ اور ربّ کے لیے خدا اور پروردگار کے مترادفات شعوری پر ردّ کر رہے ہیں۔آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا۔یہ کون سا ترقی اور خوش دلی کا راستہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنی تقریر اور تحریر ہر دو سے فارسی لفظیات کو نکال دیں اور پھر گفتگو کے مزے لیں اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کریں[۱۸]۔

میں نذر صابری صاحب کے اسلوبِ نثر کا اتنا گرویدہ ہوں کہ ان کی زندگی میں ہی میری خواہش تھی کہ کاش ان کے خطوط شائع ہو جائیں تا کہ قارئین کا ایک وسیع حلقہ اس سے لطف اندوز ہو سکے۔یہ خواہش تب تو پوری نہ ہوئی،لیکن ان کی وفات کے فوراً بعد ان کے ہم وطن،ہم مشرب اور ان کے حضر و سفر اور جلوت و خلوت کے ساتھی۔پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز

ساحر نے ان کے مکاتیب کے کلیّات کی تدوین کا بیڑا اٹھایا اور پہلی جلد کا قرعہ میرے نام خطوط کی تدوین کا نکلا۔ ساحر صاحب سے میری یاد اللہ، صابری صاحب کی حیات سے ہے اور صابری صاحب کے ایک دو خطوط میں ان کا ذکر بھی آیا ہے۔ کچھ عرصے وہ میرے ساتھ گورڈن کالج، راول پنڈی میں رفیق کار بھی رہے۔ میں نے اپنے نام صابری صاحب کے تمام خطوط کی ایک عکسی نقل ساحر صاحب کے حوالے کی۔ انھوں نے اسے مناسب حواشی اور تعلیقات کے ساتھ مرتّب کر دیا ہے اور امید ہے یہ مجموعۂ خطوط ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آ جائے گا۔

(VI)

نذر صابری کا علمی سفر ایک نظر میں[۱۹]

یہاں صابری صاحب کی تمام مطبوعات سال اشاعت (اول) کی ترتیب سے درج کی جاتی ہیں:

رومی و تبریزی (مولانا جلال الدین رومی اور شمس الدین تبریزی کی ملاقات کا احوال)، اٹک، ۱۹۶۲ء

نوادرات علمیہ اٹک (مجلس نوادرات علمیہ اٹک کی منعقد کردہ نمائش مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء میں شامل کیے گئے مخطوطات کی تفصیلی فہرست)، اٹک، [۱۹۶۳ء]

دیوان شاکر از شاکر اٹکی، اٹک، ۱۹۷۰ء (بہ شراکت سید رفیق بخاری)

فہرست مختصر مخطوطات فارسی کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی، کیمبل پور [اٹک]، ۱۹۷۳ء

گلدستہ (مختلف شعرا کا اردو نعتیہ کلام/تدوین)، اٹک، ۱۹۷۹ء

غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان و المکان، تالیف تاج الدین محمود اُشنوی، اٹک، ۱۹۸۱ء

قصۂ مشایخ تالیف خواجہ محمد زاہد اٹکی، اٹک، ۱۹۸۶ء

تذکرۂ علامہ صوفی مولانا نواب الدین رمداسی چشتی صابری، اٹک، ۱۹۹۰ء

آبروے ہر دو سرا، اٹک، ۱۹۹۲ء، اس میں عبدالعزیز ساحر، ارشد محمود ناشاد وغیرہ کے مضامین ہیں۔

واماندگی شوق (صابری صاحب کا اردو، فارسی، پنجابی نعتیہ کلام)، اٹک، ۱۹۹۳ء

رسالۂ خواجہ احرار در سلوک و تصوف (ظواہر السرائر تالیف میاں محمد عمر چمکنی سے ماخوذ)، **مجلہ نوادر**، اٹک، شمارہ ۱، ۱۹۹۳ء

دیوان ظفر خان احسن (انتخاب)، اٹک، ۱۹۹۷ء

المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ، نصر اللہ بن عبدالسلام بھیروی اٹکی، اٹک، ۱۹۹۸ء

ظواہر (ظواہر السرائر کا ایک حصہ) تالیف میاں محمد عمر چمکنی، اٹک، ۲۰۰۰ء

شاہ ربانہ شمس آبادی (اقتباسی از **قصۂ مشائخ** تالیف محمد زاہد اٹکی)، اٹک، ۲۰۰۰ء

خاتم المرسلین تالیف حافظ محمد مظہر الدین مظہر، اٹک، ۲۰۰۱ء

لذّت آشنائی (خطوط حافظ مظہر الدین مظہر بنام نذر صابری)، اٹک، ۲۰۰۲ء

تذکرۂ شہباز لامکانی مولانا غلام ربانی رمداسی چشتی صابری، اٹک، ۲۰۰۳

تذکرۂ حضرت سخی سلطان اٹکی (ماخوذ از **قصۂ مشائخ** تالیف خواجہ محمد زاہد اٹکی)، اٹک، ۲۰۰۳ء

سید صدر الدین بھاکری اور ان کے خلفا، اٹک، ۲۰۰۳ء

لذّت آشنائی ۲ (حافظ مظہر الدین سے ملاقاتیں اور باتیں)، اٹک، ۲۰۰۴ء

آفتاب شوالک (صوفی نواب الدین رمداسی چشتی صابری کی تبلیغی سرگرمیاں، مجالس، تقاریر)، اٹک حصہ دوم ۲۰۰۵ء، حصہ اول ۲۰۰۷ء یکجا چار حصے مرتبہ ارشد محمود ناشاد، اٹک ء، ۲۰۱۴ء

ارمغان اٹک بحضور سید لولاک، (مجلس شعر و ادب اٹک کے طرحی نعتیہ مشاعروں ۱۹۵۷ تا ۲۰۰۶ء پڑھا گیا کلام)، اٹک، ۲۰۰۹ء طبع دوم

المقصد الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ، تالیف صوفی نواب الدین رمداسی چشتی صابری، اٹک، ۲۰۰۹ء

منہج الرشاد لنفع العباد، تالیف شیخ زین الدین خوافی ہروی سہروردی، اٹک، ۲۰۱۲ء

معراج نامہ، (صابری صاحب کی اردو، فارسی مثنوی)، اٹک، ۲۰۱۳ء (ایک سال میں دو بار)

اداس لمحوں کی یادیں (محفل شعر و ادب اٹک کے اکتالیس اجلاس)، اٹک، ۲۰۱۳ء

بادۂ ناخوردہ (صابری صاحب کا فارسی کلام) تدوین و تقدیم ارشد محمود ناشاد، اٹک، ۲۰۱۵ء

سال اشاعت تحقیق طلب:

تحقیق الادیان فی اعجاز القرآن، تصنیف صوفی نواب الدین رمداسی، اٹک

نور و نار حافظ مظہر الدین کی غزلیات کا مجموعہ،، اٹک

انتخاب حدایق بخشش (نعتیہ کلام مولانا احمد رضا خان بریلوی)،، اٹک

تعلیقات

۱۔ میں نے اپنے روزنامچہ آئینۂ ایام، بروز بدھ، ۷ صفر ۱۳۹۵ھ/ ۱۹ فروری ۱۹۷۵ء، اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ صابری صاحب کے ساتھ پنجابی زبان و ادب کے محقق محمد عظیم بھٹی (۱۹۳۶-۱۹۹۹ء) اور نیاز کھوکھر انفارمیشن آفیسر محکمۂ اطلاعات حکومت پنجاب، راول پنڈی بھی تھے۔ میرے روزنامچے میں صابری صاحب کے ساتھ ۱۹ فروری ۱۹۷۵ء کی ملاقات ہی پہلی بار ضبط تحریر میں آئی ہے۔ اگرچہ صابری صاحب اور بھٹی صاحب سے پہلے سے آشنائی تھی لیکن کسی ملاقات کا ذکر تحریری میری یادداشتوں میں نہیں ہوا۔

۲۔ مقدمۂ معراج نامہ، اٹک، ۲۰۱۳ء، ص ۷

۳۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے ایک ایرانی مصنف ابو محمد محمود معروف بہ تاج الدین اُشنوی (منسوب بہ اُشنہ، آذربایجان) کی زمان و مکان کے موضوع پر تصنیف غایة الامکان فی معرفة الزمان و المکان کا مسلمان فلاسفہ کے ہاں چرچا رہا ہے۔ فیلسوفِ شرق محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) نے بھی اس رسالے سے دل چسپی ظاہر کی ہے۔ بدقسمتی سے اس رسالے کے انتساب کے سلسلے میں اختلاف رہا۔ یہ انتساب عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی (۱۰۹۸-۱۱۳۱ء) سے ہے اور انھی کے نام سے رحیم فرمنش نے ۱۹۶۰ اور ۱۹۸۱ء میں تہران سے شائع کیا۔ پاکستان میں لطیف اللہ (کراچی، ۱۹۸۴ء) نے اس کی اشاعت کی تو انھوں نے بھی اسے عین القضات کی تصنیف کے طور پر پیش کیا۔ نذر صابری نے بادلائل اس کی تردید کی اور اٹک سے ۱۹۸۱ء میں اسے اس کے اصل مصنف اُشنوی کے نام سے چھاپا۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی لازم ہے کہ اس رسالے کو محمود اشنوی کے نام سے چھاپنے کی اولیت سلطان السالکین حاجی میرزا عبدالحسین ذوالریاستین شیرازی کو حاصل ہے۔ انھوں نے مرداد ۱۳۱۱ شمسی (جولائی، اگست ۱۹۳۲) میں شاہ نعمت اللہ ولی کے چند رسائل کے ساتھ بطور ضمیمہ اسے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے کا نام پارہ از رسائل شاہ نعمت اللّٰہ ولی با یک رسالہ از شیخ محمود اشنوی ہے اور اسے ادارۂ مجلہ ارمغان، تہران نے شائع کیا۔

۴۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۷ مئی ۱۹۸۷ء

۵۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۹ اپریل ۱۹۹۹ء

۶۔ ''نصر اللہ بن عبدالسلام بھیروی (عالم گیری عہد کے ایک لغت شناس کاتب کے مخطوطات کا تعارف)''، مجلہ تحقیق، اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۸۹، جلد ۱۰، ش ۱۔ ۴، ص ۳۱-۳۶

۷۔ المرآقفی شرح اسماء المشکوۃ، نصر اللہ بن عبدالسلام بھیروی اٹکی نے ۱۱۰۶ اور ۱۱۲۸ھ/ ۱۷۱۴ اور ۱۷۱۶ء کے درمیانی عرصے میں تصنیف کیا۔ حدیث کی معروف کتاب مشکوٰۃ المصابیح میں آنے والے اسمائے اعلام انسان و غیر انسان و اجناس، اسماء الحسنیٰ اور اصحاب بدر کے اسماء کی شرح ہے۔ نذر صابری صاحب نے اس میں سے صرف اسماء الحسنیٰ کی شرح کو الگ کر کے مجلس نوادرات علمیہ اٹک (اگست ۱۹۹۸ء) سے شائع کیا۔

۸۔ ''نصر اللہ بن عبدالسلام بھیروی اٹکی: بارہویں صدی ہجری میں پنجاب کے ایک مصنف اور کاتب''، فکر و نظر، ادارۂ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۳۸، شمارہ ۴، محرم۔ ربیع الاول ۱۴۲۲/اپریل۔ جون ۲۰۰۱، ص ۱۰۳۔ ۱۲۳

۹۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء

۱۰۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۷ فروری ۲۰۱۱ء

۱۱۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۱ فروری ۱۹۹۱ء

۱۲۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء

۱۳۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۴ اگست ۱۹۸۶ء

۱۴۔ غایة الامکان کو عین القضات ہمدانی سے منسوب کر کے شائع کرنے میں، ایران میں رحیم فرمنش اور پاکستان میں پروفیسر لطیف اللہ شامل رہے ہیں۔ (جن کا ذکر حاشیہ نمبر ۳ میں گذر چکا ہے۔)

۱۵۔ مقدمہ مجموعۂ آثار فارسی تاج الدین اشنوی، تہران، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳

۱۶۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۷ء

۱۷۔ ملاحظہ ہو بادۂ ناخوردہ (مرتبہ ارشد محمود ناشاد، اٹک، ۲۰۱۵ء) کی جلد کی پشت پر چھپی میری تحریر۔

۱۸۔ نذر صابری بہ نام عارف نوشاہی، محررہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء

۱۹۔ نذر صابری صاحب کی تصانیف کی فہرست مرتّب اور مکمل کرنے میں دوست گرامی جناب ارشد محمود ناشاد ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ

اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد کا تعاون حاصل رہا۔اس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔مزید تفصیلات صاحب زادہ ابوالحسن واحد رضوی کی کتاب نذر صابری شخصیت اور فن تصنیف، اٹک، ملک امیر خان پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

Abstract

Arif Naushahi is well known about huge work of research and bibliographies to his credit. The minute and precise details are his another trademark. Here in this article Mr Naushahi produces letters he received from Nazar Sabiri. Mr Sabiri has done a great deal of research work in Persian language and edited many Persian classical texts. Mr Sabiri wrote letters to Mr Naushahi for over three decades. This article has four sections. Mr Naushahi in second section of it shares his rich memories with minute details which is extremely rare. Another section of the article recorded with bibliographic details of works Mr Sabiri produced.

Keyword: Letters of Nazar Sabiri, editor of Persian classical text.